پاکستانی اردو افسانے کا نسائی شعور: تقسیم ہند کے تناظر میں

Feminitic Consciousness in Pakistani Urdu Short Story: Partition of India in Context

ڈاکٹر عذرا پروین،لیکچرر اردو، وومن یونیورسٹی،ملتان

ABSTRACT:

The riots and migration which took place as a result of partition in 1947, came to the forefront as the core issues discussed in Pakistani Urdu fiction. And especially the human tragedies that trailed migration on both sides, not only attracted the attention of male fiction writers of Urdu but female Urdu writers also addressed these issues, rather they became the focal points in their stories. This article covers these varied and diverse experiences delineated in the female Urdu fiction writers' stories.

Keywords: Eradication, Psychological Disorder, Extermination of Honor and Chastity, Feeling of Unfamiliarity, Common Hindu Muslim civilization, Economic Decadence, Multidimensional Effects, Colonial India, Nostalgia

برصغیر پاک و ہند کی تقسیم، تاریخ کا ایسا بڑا واقعہ کہ جس کے اِس خطے پر کثیر الجہتی اثرات مرتب ہوئے۔ اِس واقعے نے انسانی، تہذیبی، معاشی، لسانی اور ادبی گویا ہر سطح پر ہندوستان میں بسنے والے افراد کی زندگیوں کو بُری طرح متاثر کیا۔

تاریخ میں کہیں اسے سیاسی فیصلہ تصور کیا گیا تو کہیں مذہبی و ثقافتی بعد کا ناگزیر نتیجہ۔ غرض مختلف مکاتبِ فکر سے متعلق مفکرین اور ادباء نے اسے اپنے نقطۂ نظر سے سمجھا اور سمجھایا۔ مثلاً پاکستانی مورخین اور بظاہر نظریۂ پاکستان کے محافظین نے اِسے ایک ایسا ناگزیر عمل ثابت کرنا چاہا ہے جو کئی سو برس کی ہندمسلم معاشرت کے اشتراکات کے باوجود باہمی یگانگت کی فضا کو تشکیل نہ دے سکا اور جس سے دوقومی نظریے کی بنیاد پڑی جبکہ دوسری طرف ہندو مورخین یا اکھنڈ بھارت کے حامی محض انگریزوں کو ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کو بھی بیرونی حملہ آوروں کی صورت دیکھتے اور اِن سے آزادی کے خواہاں نظر آتے ہیں۔ وہ ہمیشہ ایک ایسے ہندوستان کے خواب گر بنے جہاں محض ہندو حکمران ہوں اور اُنہی کی اجارہ داری بھی قائم رہے۔ تاہم یہ سوال تا حال اپنی جگہ موجود ہے کہ وہ مذہبی تفاوت جو دیکھتے ہی دیکھتے مذہبی منافرت اور فرقہ واریت میں ڈھل کر بے شمار خوں ریز واقعات کا باعث بنی، ہندوستان کے زمینی حقائق کے سبب تھی یا انگریزوں کے اس تصور کا نتیجہ کہ تقسیم کرو اور حکمرانی کرو۔ اِس ضمن میں دو طرح کے نقطہ ہائے نظر کا بیان فی الوقت دیا جا رہا ہے۔ جن میں ایک نقطہ نظر غیاث الدین کی اُس مجموعی رائے کا

عکاس ہے کہ جو اس فرقہ واریت کو تاریخ کے ناگزیر عمل کا نتیجہ قرار نہیں دیتے بلکہ اسے انگریز راج کے سوچے سمجھے منصوبے کا شاخسانہ قرار دیتے ہیں۔(۱)

جبکہ دوسری جانب نامور برطانوی تاریخ دان آئن تالبوٹ کا نقطہ نظر بھی قابلِ توجہ ہے جو تاجِ برطانیہ کو اس کا ذمہ دار نہیں سمجھتے اور برطانوی حکمرانوں کے نزدیک مذہبی رواداری اور مساوی حقوق کی حفاظت کو اُن کی اہم پالیسی گردانتے ہیں جس کا ثبوت اُنکے مطابق یونینیسٹ پارٹی کے سیکولر تصور اور کینال کالونیز کی تقسیم میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔(۲)

تاریخ کو اپنے اپنے قوم پرست مورخین کے بیانیے سے سمجھنے کی اِس روایت کے ساتھ ساتھ اب مابعد نو آبادیاتی عہد میں تاریخ کے مطالعے کے اُس تیسرے پہلو کی طرف بھی توجہ دلائی جا رہی ہے جو بے شمار مستند تصورات اور مفروضوں کو از سرِ نو دیکھنے اور سمجھنے کی دعوت دے رہا ہے۔ اس حوالے سے ناصر عباس نیّر کا خیال ہے کہ تاریخ نویسی کے رائج تصورات ہیرو ازم، نسلی یا طبقاتی تفاخر کو جنم دیتے ہیں اور یوں تاریخ کے بے شمار لائقِ توجہ پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اب مابعد نو آبادیات، تصورِ تاریخ کی اُس تعبیر کے قائل ہے جہاں اُسے کسی مرعوبیت یا تفاخر کے بغیر دیکھا اور سمجھا جائے۔ اِسی طرح ہم تاریخ کی ایک بہتر اور موثر تفہیم کے قابل ہو سکتے ہیں۔(۳)

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ تقسیم ہند کو جس سہولت سے ہندوؤں اور مسلمانوں کی ازلی الگ الگ شناخت اور مذہبی یا ثقافتی آزادی کے متضاد تصورات کے تناظر میں دیکھا جاتا ہے وہ ایک ضمنی تعبیر تو ہو سکتے ہیں حاصلِ مطالعہ ہرگز نہیں۔ تاہم یہ بھی اپنی جگہ تلخ حقیقت ہے کہ فطری یا باقاعدہ منصوبے سے پیدا کی جانے والی اس تقسیم اور ہجرت کے نتیجے میں جس انداز میں بے دریغ انسانی خون بہایا گیا، کی مثال بھی تاریخ میں کم کم ہی ملتی ہے۔ تقسیم ہند کا یہ واقعہ تاریخ کے ایک ایسے دور میں پیش آیا جو ہندوستان میں محض سیاسی ہی نہیں ادبی تحریکوں اور نت نئے رجحانات کے ورود و قبول کا عہد بھی تھا۔ مختلف ادیب اور دانشور مختلف ادبی نظریات کی روشنی میں ادب کی نئی شعریات مرتب کر رہے تھے۔ مارکسی فکر سے متاثر ترقی پسند ادباء ادب کو تاریخ کے مادی جدل اور عہد نو کے بدلتے ہوئے سیاسی، سماجی شعور کے تناظر میں سمجھ اور سمجھا رہے تھے جبکہ دوسری جانب ردِ عمل میں ادب کے خالص فنی اور جمالیاتی نقطہ نظر کے مبلغین سِرے سے سماجی شعور ایسی اصطلاح ہی سے بدکنے لگے تھے۔ ایسے عالم میں ہندوستان میں آزادی کی تحریک و تقسیم اور پھر ہجرت کے مراحل کئی مباحث کو سامنے لے آئے۔ ایک بڑا سوال یہ بھی پیدا ہوا کہ کیا ادب کو کسی بھی نظریاتی یا جغرافیائی سرحد کا پابند کیا جا سکتا ہے نیز یہ کہ اِس بحران اور قتل و غارت گری کے گرم بازار میں ادیب کو کس کا ساتھ دینا چاہیے، ان سوالات نے رفتہ رفتہ باقاعدہ ایک ادبی نقطۂ نظر کی صورت اختیار کر لی۔ یہ وضاحتیں کہیں تخلیقی بیانیوں کا حصہ ہیں تو کہیں تنقیدی افکار کا۔ اِس حوالے سے ڈاکٹر عبادت بریلوی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''قیام پاکستان کے نتیجے میں برعظیم میں جو سیاسی تبدیلی ہوئی اُس نے تہذیب اور تہذیبی شعور کو بھی

نئے حالات سے دوچار کیا۔خصوصاً پاکستانی افسانہ نگاروں نے تہذیبی اقدار کی شکست و ریخت کو شدّت سے محسوس کیا۔مسلمانوں کی ایک تہذیب جو پیچھے رہ گئی اوراس کا جو حشر ہوا اُس کا احساس و شعور قیامِ پاکستان کے بعد سامنے آنے والے پاکستانی افسانہ نگاروں میں شدید نظر آتا ہے۔''(۴)

منٹو نے تقسیم اور ہجرت کے نتیجے میں جنم لینے والے اس بحران کو انسانی المیے کی صورت محسوس کیا۔منٹو کے نزدیک اس تقسیم اور ہجرت کے نتیجے میں جنم لینے والے فسادات اور صعوبتیں کہ جس میں انسانیت کا بے دردی سے خون بہایا گیا، ہندو مسلم بربریت کے بجائے انسانی سرشت سے بیدار ہونے والی اُس سفا کی کی صورت سامنے آئی کہ جس پر بقول فرائیڈ شعور کا پہرہ اور تہذیب کا غلبہ منسوخ کر دیا جائے:

''یہ مت کہو کہ ایک لاکھ ہندو اور ایک لاکھ مسلمان مرے ہیں۔ یہ کہو کہ دو لاکھ انسان مرے ہیں۔۔۔ یہ اتنی بڑی ٹریجڈی نہیں کہ دو لاکھ انسان مرےہیں۔ٹریجڈی اصل میں یہ ہے کہ مارنے اور مرنے والے کسی بھی کھاتے میں نہیں گئے۔''(۵)

منٹو کی طرح انتظار حسین بھی تقسیم اور ہجرت کو ایک تہذیبی المیے کے طور پر دیکھتے ہیں کہ نئی زمین اور نئے زمانوں کو خوش آمدید کہنے کے باوجود پرانی بستیاں اور مکان اُن کے اندر سانس لیتے محسوس ہوتے ہیں:

''بستیاں خالی جغرافیہ نہیں ہوتیں اور محض زمین پر آباد نہیں ہوتیں۔آدھی زمین پر ہوتی ہیں اور آدھی دل و دماغ میں بسی ہوتی ہیں۔اس لئے اِس کا جغرافیائی نام بتانے کا کوئی فائدہ نہیں۔''

(۶)

دراصل تقسیم و ہجرت کے جاں سوز مراحل یقیناً ایسے نہ تھے جو کسی بھی تخلیق کار کو سماج سے بے گانہ رکھ سکتے۔بقول شہزاد منظر:

''تقسیم ملک کے وقت جو غیر معمولی حادثات اور انسانیت سوز واقعات رونما ہوئے اور جس طرح ایک منجمد اور ٹھہری ہوئی زندگی میں انتشار اور اتھل پتھل ہوئی اس نے ادیبوں کو بہت دنوں تک سنبھلنے نہ دیا۔ بڑے پیانے پر فرقہ وارانہ فسادات، وسیع پیانے پر قتل و غارت گری اور ایک کروڑ انسانوں کا تبادلۂ آبادی ایسے واقعات نہ تھے جن سے ادیب و شاعر متاثر ہوئے بغیر رہتے۔ان حادثات نے ایک عرصے تک ادیبوں اور شاعروں کے ذہن کو ماؤف رکھا۔''(۷)

بہر حال یہ اپنی جگہ حقیقت ہے کہ ہجرت کے اس بڑے تجربے نے آغاز میں جن ہنگامی حالات کے پیشِ نظر وقوع پذیر ہونے والے انسانی المیوں کو براہِ راست موضوع بنایا، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس ہنگامہ خیزی میں ایک ٹھہراؤ آنے لگا اور یوں یہ موضوع ایک سنجیدہ تخلیقی تجربے میں ڈھلتا گیا۔یہی وجہ ہے کہ ہجرت کا یہ تجربہ ہندو پاک ادیبوں کے ذہنوں پر کچھ ایسے نقوش چھوڑ گیا جنہیں مٹانا شاید آسان نہ تھا۔اس حوالے سے نذیر احمد کا کہنا ہے:

''ہجرت کا مسئلہ بڑا پیچیدہ ہے۔اگر اس کی نوعیت صرف نقل مکانی ہوتی تو بھی اس سے ذہنوں پر گہرے تاثرات مرتب ہوئے، لیکن جب مسلمانوں نے ہندوستان چھوڑا تو صرف زمین نہیں چھوڑی، آباؤ اجداد کی یادگاریں چھوڑیں اور وہ اپنی تاریخ کی زندہ جاوید شہادتوں سے منقطع ہو گئے۔''(۸)

مختصر یہ کہ ہجرت کے اِس تجربے (۱۹۴۷ء) نے پاکستانی اُردو افسانے میں مختلف جہتوں کو سمویا۔کہیں اس کے محرکات کو موضوع بنایا گیا تو کہیں اس سے جنم لینے والے فسادات کو جبکہ کہیں ہجرت وفسادات سے جنم لینے والی تنہائی، بے گانگی اور یاد موضوع بنے۔مرد افسانہ نگاروں میں احمد ندیم قاسمی، اشفاق احمد، انتظار حسین، سعادت حسن منٹو، شوکت صدیقی، غلام عباس، قدرت اللہ شہاب وغیرہ اس موضوع پر لکھنے والے معتبر حوالے قرار دیے جا سکتے ہیں۔تاہم ایسینا مور ادیبوں کے ساتھ ساتھ پاکستانی نامور خواتین کہانی کاروں مثلاً اختر جمال، الطاف فاطمہ، خدیجہ مستور، قرۃ العین حیدر اور ہاجرہ مسرور وغیرہ نے بھی ہجرت وفسادات سے جمپ لینے والی ہولناکی کو اپنا موضوع بنایا۔زیرِ نظر مقالے میں ہجرت وفسادات کی المناک صورتحال کو اپنی کہانیوں (افسانوں) کا موضوع بنانے والی انہی خواتین کے نمائندہ افسانوں کا تنقیدی وتحقیقی جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔

جہاں تک ہجرت کے تجربے کی نوعیت کا تعلق ہے تو بنیادی طور پر یہ کسی عظیم مقصد، آدرش یا نظریۂ حیات کے استحکام وبقا کے تحفظ کی جنگ کے عملی اقدام کا نام ہے۔تاریخ گواہ ہے کہ اس مقصد کے لئے لوگوں کو بہت سے تاوان ادا کرنے پڑے، کئی ذہنی ونفسیاتی عوارض مہاجرین کا مقدر بنے، اُنہیں تہذیبی ومعاشرتی اور سماجی اقدار کی پامالی وتبدیلی کے دُکھ سہنا پڑے، مال واسباب کے ساتھ ساتھ عزتوں کی پامالی اور عزیز واقارب کی جانیں بھی گنوانا پڑیں۔دوسری طرف خوابوں اور اُمیدوں کی نئی سرزمین بھی اُن میں سے بیش تر کے لئے روزگار وشناخت کے فقدان، عدم تحفظ، خوف وہراس اور تشکیک وآبادکاری ایسے لاینحل مسائل کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

ترقی پسند افسانہ نگار اختر جمال مجموعی طور پر اپنی کہانیوں میں ۱۹۴۷ء اور ۱۹۷۱ء کی تقسیم کے نتیجے میں وقوع پذیر ہونے والی ہر دو ہجرتوں کو اِنسانی تحقیر وتذلیل کا تسلسل قرار دیتی ہیں۔اُن کی کہانیوں میں پٹنہ وبہار سے ہجرت کر کے آنے والے مہاجرین اپنی آزاد خود ومختار اسلامی ریاست میں بھی ذہنی ابتلاء کا شکار نظر آتے ہیں۔المیہ یہ کہ ۴۷ء میں اپنے عزیزوں کے اعضاء اور خون سے ندیاں بھر کر قربانی دینے والے مہاجرین اِس بات سے بھی بے خبر تھے کہ اُنہیں ایک بار پھر دربدری کا عذاب (۷۱ء کی صورت) سہنا پڑے گا۔مثلاً زرد پتوں کا بن، چھوٹی سی دُنیا اور چکن کا کُرتا اُن کے ایسے افسانے ہیں جن میں مہاجرین اپنے عزیز واقارب اور آباؤ اجداد کے ورثہ وسرمائے کے لئے تڑپتے اور سسکتے نظر آتے ہیں:۔

''۔۔۔۔میں کون ہوں؟ کوئی مجھے اپنا نام ونشان بتائے۔میں بہار کا ہوں، ڈھاکہ کا ہوں یا

پاکستانی۔۔۔؟ یا بنگلہ دیش کا ہوں۔۔۔۔یا۔۔۔۔۔۔یا کسی نامعلوم خطے کا جہاں مجھے چل کر جانا ہے۔''(۹)

جبکہ اُن کا افسانہ ''چھوٹی سی دُنیا'' کو سرحد کے اطراف اپنوں کی چاہت کے لئے تڑپتے خاندانوں کا منظر نامہ قرار دیا جاسکتا ہے۔اسی طرح اپنے افسانہ ''چکن کا کُرتا'' میں اختر جمال ۴۷ء کی تقسیم وہجرت کے نتیجے میں منقسم باعزت خاندانوں کے اس المیے کو موضوع بناتی ہیں کہ جس میں بھائی اپنے خوابوں کی نئی سرزمین کو سینے سے لگا لیتا ہے۔ یہ جاننے کی زحمت گوارہ نہیں کرتا کہ اُس کی باحیا اور باکردار بہن کو سیٹھ ساگرمل کی داشتہ کی حیثیت سے ہندوستان میں ہے۔وہ مجبور و بے بس بہن اذیت کے ان ایام میں بھی اپنے مذہب اور بھائی کی محبت کو دل سے نہیں نکال پاتی چکن کے کرتے کا ڑھ کا ڑھ کر نذر نیاز دلواتی ہے اور ہر آن بھائی کی آمد کی منتظر رہتی ہے حالانکہ ہر گزرتا لمحہ اُسے یہ بھی باور کرواتا رہتا ہے کہ:۔

''آخر۔۔۔آخر کیوں؟

ایک معزز مسلمان گھرانے کی بیٹی جو سیٹھ ساگرمل کی داشتہ ہے اُس کا بھائی اُسے کیوں خط لکھے گا؟

لیکن اُس نے پوچھا تو ہوتا ان بیس برسوں میں ہم پر کیا گزری۔۔۔''(۱۰)

اختر جمال کے ساتھ انگریزی راج کے زمانے میں آنکھ کھولنے والی الطاف فاطمہ (کہ جنہوں نے تقسیم و فسادات اور ہجرت کا براہِ راست ہنگامہ دیکھا) کے ہاں ''کہیں یہ پُروائی تو نہیں'' ایسا افسانہ پاک و ہند کی تقسیم اور ہجرت کے کرب کو اپنے جلو میں اِس طور پیش کرتا ہے کہ اُس کی پیش کش اور کہانی پن اُسے صحافیانہ ادب کی صف سے نکال کر بڑے کہانی کاروں کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے۔افسانے میں ہزاروں سال اکھٹے رہنے والے ہندو مسلم سبھی کردار ایک دوسرے کی تہذیب کے ساتھ یوں جڑے اور احترام کرتے نظر آتے ہیں کہ منقسم ہونے کے طویل عرصہ بعد بھی متکلم کو اپنا ماضی ایک حسین یاد کی مانند دکھائی دیتا ہے ایسا ماضی، جس کے سوتے مشترکہ اور غیر منقسم رشتوں کی سرزمین سے پھوٹتے تھے۔کہانی کا مرکزی کردار ''ربی دت'' ہندو ہے مگر اپنے ہمسایہ مذاہب کے احترام کے سبب ایسی شاندار عظمتِ اِنسانی کی نمائندگی کرتا ہے کہ اشفاق احمد کے کردار داؤجی (گڈریا) کی یاد دلا دیتا ہے۔وہ ہندو ہونے کے باوجود اپنے گھر میں مسلمان ہمسایوں کی مانند میلاد کی محفل سجاتا ہے یقیناً یہی سبب ہے کہ متکلم کی حسین یادوں میں بسا اُس کے بچپن کا یہ ہمسایہ، دوست 'ربی دت' اپنی عظمت اور اِنسان دوستی کے سبب لازوال ہو جاتا ہے:

''جب میرے اور تمہارے درمیان اُستادی شاگردی کا رشتہ ٹوٹ گیا تو تم نیا ایک دوسرا رشتہ یوں جوڑا کہ دروازے کی اوٹ میں کھڑے ہو کر اپنی بیٹھی بیٹھی سی آواز میں رٹ لگا دی، تم کیسی بہنی ہو، تم ہمرے راکھی بھی نا ہیں باندھت ہو۔اوروں کی بہنیں تو بھیا لوگن کے راکھیاں باندھت ہیں۔''(۱۱)

زمیں میں لنلھجورے کی مانند اپنی جڑیں پیوست کرنے والا دوستی کا یہ رشتہ اُن موسموں اور رُتوں کی باس کو

نہیں بُھلا پاتا جن کی اساس محبت کی خوشبو اور مٹھاس تھے۔ پورے افسانے میں متکلم کا اِن بھولی بسری یادوں کے ساتھی کے ساتھ مکالمہ جاری رہتا ہے۔

خدیجہ مستور کے افسانے ''مینوں لے چلے بابلا'' اور ''ٹامک ٹوئیے'' کا موضوع بھی پاک و ہند کی تقسیم کے نتیجے میں نہ ختم ہونے والے فسادات سے جنم لینے والے وہ زہر خند روّیے ہیں جو ہر دو طرف بے بس عوام بالخصوص جنسی تشدد کا شکار ہوتی عورت کا اس طور مقدر بنے کہ عزت وعصمت کی پامالی کے ساتھ ساتھ عزیز واقارب کی جدائی اور اپنوں کی نارسائی کے کرب اور گھاؤ بھی اُنہیں اپنے ہی جسم وروح میں اُتارنا پڑے۔

''مینوں لے چلے بابلا'' کا متکلم کردار کہانی میں ایک رضا کار ہے جس نے فسادات کے دوران رومانوی حسین آنکھوں کے خوابوں کو خوفناک انجام سے دوچار ہوتے دیکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تقسیم کے بعد بھی دیر تک اسے فسادات اور بلوائیوں کے وہ پُر تشدد ایام واقدام تڑپاتے ہیں جن میں ہر شخص وحشت اور درندگی سے اپنا تعلق جوڑے ہوئے تھا۔ اُسے یاد آتا ہے کہ جب وہ مشتعل گروہ کے غیض وغضب سے حسین آنکھوں میں خواب سجائے لڑکی کو (کہ جسے اپنے پیا کے واپس آنے کی چٹھی مل چکی ہوتی ہے) بچانے کے لئے منت سماجت کرتا تھا تو مشتعل گروہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُسی سے یہ سوال کرتا تھا۔

''۔۔۔۔۔ جب ہماری ماؤں، بہنوں اور ہمارے بھائیوں کو خون میں نہلایا جا رہا تھا جب اِنسانیت کہاں تھی اور جب آپ کہاں تھے۔'' (۱۲)

فسادات کے ایام میں جبر واستبداد کا شکار ہونے والی ایسی ہی دیگر بے بس خواتین کی ایک اور تصویر کشی خدیجہ مستور کے افسانہ ''ٹامک ٹوئیے'' میں ملتی ہے۔ جس میں ہمیں کہانی کار بتاتی ہے کہ عزت ومحبت کے لئے تڑپتی اور سسکتی ان عورتوں کو کس طور غلامی کی قید سے نجات کی خواہش کے بھاری تاوان ادا کرنے پڑے۔ جیل میں محبوس یہ عورتیں کبھی اُن خاندانوں کا حصہ تھیں جہاں دوپٹے کا سر سے کھسکنا اور لڑکوں سے ہنسی ٹھٹھا لگانا بھی معیوب سمجھا جاتا تھا۔ حالات کی سنگینی نے اُن سے اُنکی معصومیت چھین کر اُنہیں اپنی ہی نظروں میں مجرم بنا دیا تھا۔ اب معصوم شکل و صورت والی، خاموش سانولی اور جاپانی گڑیا کی مانند خوبصورت لڑکیاں، سب کی سب مسترد کئے جانے کے احساس سے دوچار تھیں۔

''وہ پھر وہیں تھی جہاں اُس کے رہنے بسنے کا حق چھین لیا گیا تھا۔ جہاں لامذہب انسانیت ہندو ہوگئی تھی، مسلمان ہوگئی تھی۔'' (۱۳)

اُردو کے افسانوی ادب میں مُنفرد اسلوب، پختہ علمی، تہذیبی اور تاریخی شعور کی حامل تخلیق کار قرۃ العین حیدر جب فسادات کے بطن سے جم لینے والی ہجرت کی کہانیاں لکھتی ہیں تو اُس مشترکہ ہندا سلامی کلچر کی بازیافت کی کوشش کرتی ہیں جو ہر دو مذاہب سے تعلق رکھنے والے افراد کی مشترکہ تہذیبی میراث تھا۔ انتظار حسین کی مانند اُنہیں

بھی جڑوں کی تلاش ہوتی ہے مگر اُن کے ہاں تہذیب علاقائی کلچر کے بجائے تہذیبی روایات کا وہ تاریخی تناظر ہے جو تخلیق کا رشتہ ماضی سے استوار کرنے کے ساتھ حال و مستقبل کی بھی توسیع کرتا چلا جاتا ہے ہر چند کہ یہاں دونوں کہانی کاروں کی خلاقانہ صلاحیتوں سے انکار محال ہے تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ قرۃ العین حیدر کا دائرہ کار انتظار حسین سے ان معنوں میں زیادہ وسیع ہے کہ وہ اپنی کہانیوں میں ہندمسلم تہذیب کے ساتھ دیگر تہذیبوں کا بھی احاطہ کرتی نظر آتی ہیں۔ دوقومی نظریے کے برعکس نیشنلسٹ رویے کی حامی دکھائی دیتی ہیں اپنی مختصر کہانیوں میں بھی وہ مشترکہ ہندمسلم تہذیب کو آئیڈ یلائیز کرتی نظر آتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے افسانوں میں مشترکہ ہنداسلامی تہذیب کے پسندیدہ اقدار کا زوال، محفلوں کی پژمردگی، دوست احباب اور عزیز رشتوں کا بکھراؤ نیز انسانی روایات کی شکست وریخت کا ملال پایا جاتا ہے۔

ان کے افسانے 'حسب نسب'، 'برفباری سے پہلے'، 'یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر'، 'دریں گرد سوارے باشد' اور 'یاد کی اک دھنک جلے' وغیرہ کا موضوع تقسیم و ہجرت ہے۔ افسانہ برفباری سے پہلے، کا انداز ناسٹلجیائی ہے جبکہ حسب نسب، میں کہانی کے مرکزی کردار چھمی کے خاندان پر نازل ہونے والی آفات کو تقسیم برصغیر کی پرچھائیں قرار دیا جاسکتا ہے۔ والدین کی وفات اور تقسیم ہند کے سانحات کو ایک ساتھ جھیلنے والی یہ چھمی جس طور معاشی محتاجی کا سامنا کرتی ہے، کے حوالے سے اس افسانے کو اُس عہد کے معاشی زوال کی داستان قرار دیا جاسکتا ہے۔ جبکہ افسانہ برفباری سے پہلے میں مرکزی کردار بوبی ممتاز کی ہجرت سے جُڑی یادوں کی کسک اور ملال کو موضوع بنایا گیا ہے۔

بوبی ممتاز اپنوں سے دور رہ کر اجنبی اور غیر مانوس منزلوں کو طے کرنے والا ایسا بے بس اور دوہری اذیت کا شکار کردار ہے جسے کوئٹہ میں گزرنے والی یخ بستہ راتیں اپنی 'سوری' میں گزاری گئی اُن راتوں کی یاد دلاتی ہیں کہ جہاں اُس کے ساتھ خوشیاں اور غم کے لمحات بانٹنے والے اس کے دوست کوئینی، وجاہت، فریڈلو، سگرڈ اور نشاط اسٹینلے موجود ہوتے تھے اور جنکی بے لوث دوستی کی بدولت وہ خود کو دُنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھتا تھا۔ بوبی ممتاز کی یادوں کا یہ سلسلہ گھڑی پر بجنے والے وقت یعنی آٹھ/ بچپن (8.55) سے شروع ہوتا ہے کہ عین اُسی وقت اُس کی دوست کوئینی لکھنؤ کے ریڈیو اسٹیشن پر روزانہ انگریزی میں موسم کا حال سُنایا کرتی تھی۔

''۔۔۔۔۔۔کوئینی۔۔۔۔۔کوئینی بی بی۔۔۔۔۔ وجو۔۔۔۔۔۔فریڈ کہاں ہوتم سب۔۔۔۔۔

اس وقت تم سب جانے کیا کر رہے ہوگے۔ اُس نے بہت تھک کر آنکھیں موندلیں۔''(۱۴)

قرۃ العین حیدر کے افسانہ ''یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر'' کا مرکزی موضوع بھی ہجرت ہے۔ اس افسانے میں وہ ہجرت کے المیے کا شکار اشرافیہ کی اُس نوجوان نسل کو موضوع بناتی ہیں جو نئی سرزمین کو خوابوں کی سنہری سرزمین سمجھ کر نعرے لگاتی، تقاریر کرتی اور جلوس نکالا کرتی تھی اور جن کی ہندوستان کی بڑی جامعات سے حاصل کردہ

ڈگریوں کو دہلی اور بمبئی کے ایئر پورٹس پر ہی چھین لیا گیا تھا۔ گویا فنونِ لطیفہ کی دلدادہ اِن لڑکیوں کے لئے خوابوں کی سرزمین خاصی کھردری ثابت ہوئی۔ کہانی کے اختتام میں یہ جگ بیتی قرۃ العین حیدر کی آپ بیتی میں بدل جاتی ہے اور وہ اس قصے کی میں اُن حقائق کی آمیز شکرتی نظر آتی ہیں جو براہِ راست خود اُن کی ذات پر بیتے۔

''قصہ اس فدوی کنیز ناچیز کا ہے کہ اِس انقلاب قیامت ہمرکاب میں یہ خاکسار بھی حتی المقدور خدمت ملک وقوم کی بجالائی۔ فکر وغم سے اس درجہ پریشان تھی کہ راتیں آنکھوں میں کٹتی تھیں۔ دن رات ایک ٹانگ پر کھڑی ہو کر شرنارتھیوں کا' پھر بساؤ، کام کیا۔۔۔ لیکن تابکے۔۔۔ بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے۔ ایک روز اس خاکسار کو بھی بعد رنج وبچشم۔۔۔ اس دیش کو چلا آنا پڑا۔''

(۱۵)

اِسی طرح اپنیا یک اور افسانہ ''دریں گرد سوارے باشد'' میں قرۃ العین حیدر اُن متمول اور خوشحال والیانِ ریاست اور ولی عہدوں کا زوال دکھانے کی کوشش کرتی ہیں کہ جنہیں ہجرت کے اذیت ناک مراحل سے گزرنا پڑا۔ اس افسانے میں دلی، کلکتہ، میسور، لکھنؤ اور مُرشد آباد کی قد آور تاریخی شخصیات کے معاشی واقتصادی زوال و بد حالی کا دردناک بیان ملتا ہے یہاں قرۃ العین حیدر کا وسیع تاریخی وتہذیبی شعور زمان ومکان کی قید سے آزاد ہو کر اپنے تخیل سے مہمز اپا تا اور افسانے کو لازوال بنا دیتا ہے۔ بقول غیاث الدین شیخ:۔

''دریں گرد سوارے باشد، میں آگ کا دریا کی طرح خاندان کا طویل تاریخی سلسلہ پیش کیا گیا ہے۔ ترک مغل غدر ۵۷ء، تشکیل پاکستان اور مسلمانانِ ہند کی لمبی تاریخ یہاں موجود ہے۔''(۱۶)

اِسی افسانے میں وہ بتاتی ہیں کہ کس طرح برصغیر کی تقسیم کے بعد متمول خاندانوں کے معاشی زوال میں ریاستوں کے نوابین اپنے شجرے تک کھو بیٹھے۔ مرشد آباد کے باقیات الصحالحات کلو خاں ایسے لوگوں کو پیٹ کی دوزخ بھرنے کے لئے ہجرت کے بعد ایسے ایسے ناگوار کام بھی کرنا پڑے کہ جس کا ایام آسودگی میں تصور بھی محال تھا، متکلم کو اپنا مظفر نامہ سنانے والے کلو خاں کی زبانی ہی ذرا اس کا حال زار ملاحظہ فرمائیں:

''بات گے ہے بیا'' اُنہوں نے کھنکار کر کہا۔ اِس قیامت کے بعد اس شہر کے خاکروبوں کا بائیکاٹ کر دیا گیا۔۔۔ ہم بیس تیس آدمی اس کام میں لگ گئے میں بھی شہر آ گیا۔ اس میں پیسہ بہت مل جاتا ہے۔۔۔ بارہ جنوں کا ٹبر، کمانے والا اکیلا میں۔۔۔ ڈھاٹا منہ ناک پر واپس کھسکا کر وہ لنگڑاتے ہوئے غسل خانوں کی سمت چلے گئے۔''(۱۷)

نظریاتی اعتبار سے خدیجہ مستور کی مانند ترقی پسند تحریک سے براہِ راست تعلق رکھنے والی اُنکی بہن ہاجرہ مسرور کی کہانیوں کا مرکزی موضوع تو اگرچہ عورت کی مظلومیت کا روایتی بیانیہ ہے تاہم عصری شعور سے ہم آہنگی کی بدولت ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں اور تقسیم کے نتیجے میں وقوع پذیر ہونے والی ہجرت کو بھی وہ اپنی کہانیوں ''کنیز، اُمت

مرحوم‘ اور اندھیرے اُجالے کو موضوع بناتی ہیں۔

افسانہ ’اُمتِ مرحوم‘ میں تو وہ والتق کیمپ میں مقیم مہاجرین کے حالتِ زار کی براہِ راست تصویر کشی کرتی ہیں جس میں بالائی طبقے کے کھوکھلے رویوں کو ہدفِ تنقید بنانے کی کوشش کی گئی ہے جو مہاجرین کے دُکھ درد اور تڑپتی سسکتی لاچار زندگی کو طائرانہ نظر سے دیکھتے، خلوص سے عاری اور دکھاوے سے معمور ہمدردی جتاتے نظر آتے ہیں۔ کہانی میں شہنی کا کردار ایسے ہی زوال آمادہ معاشرے کے افراد کی نمائندگی کرتا ہے کہانی کا یہ مرکزی کردار خود بھی ہجرت کر کے اپنی ماں کے ساتھ ہندوستان سے پاکستان آتا ہے لیکن سیر و تفریح کی رسیا اور ہوٹلوں کے اچھے کھانوں کی شوقین اِس شہنی کے لئے ہجرت کرنے والی ماں کا دُکھ اور ملال بھی محض ایک بات یا واقعے کی حیثیت رکھتا ہے۔ لاہور میں اپنے متمول رشتہ داروں کے گھر قیام کرنے والی یہ شہنی ایک روز والتق کیمپ میں شب و روز گزرانے والے مہاجرین کا جائزہ لینے کا بھی پروگرام بناتی ہے جہاں مہاجرین کی حالتِ زار دیکھ کر اُس پر جلد ہی بیزاری اور اُکتاہٹ کے آثار نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ بیرکوں میں ننگ دھڑنگ نیم عریاں بچے، میلے کچیلے مرد اور غلیظ عورتیں دیکھ کر اُسے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کوڑا کرکٹ کی لاری میں ضرورت سے زیادہ کوڑا بھر دینے کی کوشش میں اردگرد بھی کوڑے کے ڈھیر لگا دیے گئے ہوں۔

کیمپ میں ڈیوٹی پر موجود طبی عملے اور خود کو مہاجرین کے حوالے سے بظاہر حساس ثابت کرنے والے ڈیوٹی ڈاکٹر کا بے نیاز رویہ بھی شہنی سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوتا۔ سُرخ بوٹیوں جیسے ہاتھ پاؤں مارتے بچے، درد سے کراہتی زچاؤں اور میلے بستر پر شرماتی بدصورت، کمزور ننگی عورتیں اور میدان میں مٹی کی ڈھیریوں کی صورت پناہ گزینوں کی قبریں دیکھ کر شہنی کے ساتھ آنے والے کرنل کا یہ جملہ مہاجرین کی حالتِ زار کا عمدہ عکاس بن جاتا ہے۔

> ’’چچ چچ۔۔۔!اِن بے چاروں کو کیا معلوم تھا جی کہ پاکستان پہنچ کر بھی مر سکتے ہیں۔‘‘
>
> کرنل نے ٹھنڈی سانس بھری، ’’انہیں تو خیال بھی نہ ہوگا کہ موت ہندوؤ؟ں اور سکھوں کے چھروں کے علاوہ بھی کہیں آسکتی ہے۔‘‘(۱۸)

ہجرت کے موضوع پر ہاجرہ مسرور کا ایک اور افسانہ ’’کنیز‘‘ ہے جو اِس لحاظ سے قابلِ ذکر ہے کہ یہ ہفت روزہ ’نصرت‘ کے مہاجرین نمبر مطبوعہ ۱۹۵۹ء میں بھی شامل کیا گیا تھا۔ افسانے کا موضوع ’کنیز‘ ایسی بدنصیب اور بے بس مہاجرین ہیں جنہیں خوابوں کی سرزمین پر نامساعد حالات کے ساتھ ساتھ ایسے لوگوں کا بھی سامنا تھا کہ جنہوں نے شعوری و لاشعوری طور اپنی ہمدردی اور خلوص کو مہاجرین سے حاصل کی گئی خدمت گزاری کے ساتھ مشروط کر دیا تھا۔

> ’’۔۔۔۔بڑی بیگم نے اپنی چھنگلیا کا سونے کا چھلا تک اُتار کر اُسے پہنا دیا اور چپکے سے اُس پر جُھک کر بولیں، ہماری کنیز کا دولہا اس طرح انگوٹھی پہنائے گا۔ اور کنیز اُس دن چمی کی موت کے

بعد پہلی مرتبہ شرما کر کمرے میں بھاگ گئی اور آہستہ آہستہ وہ پھر یوکلپس ۔،شیشم اور گولہ کے درختوں میں دُبکی ہوئی پُراسراری کوٹھی میں چھلاوہ بن گئی۔''(۱۹)

''اندھیرے اُجالے'' میں ہاجرہ مسرور مہاجرین کے کیمپوں میں مدد کے لئے آنے والے اِن رضا کاروں کی ظاہری ہمدردی کی آڑ میں چھپی بدنیتی ایسے حساس پہلو کو موضوع بناتی ہیں جو خوبصورت لڑکیوں اور اُن کے والدین کو تو ضرورت سے زائد خوراک رضا کارانہ فراہم کرتے ہیں بلکہ اُنکی مدد کے لیے ہر وقت تیار نظر آتے ہیں جبکہ اُسی کیمپ میں بدنصیب کٹے ہوئے ہونٹ والی بدصورت لڑکی اور اُس کی ماں کو پہروں بھوکا رہنا پڑتا ہے:

''مہاجر کیمپ میں اس کی ماں کیونکر مری،لنگر کی روٹی بانٹنے والے،ان ماں بیٹی کی طرف سے بار بار گزرتے مگر بیٹی کا کٹا ہوا بھیانک ہونٹ، دیکھتے یا روٹی دیتے۔ماں بھوک سے بلبلا کر چیخی کہ اوروں کی بیٹیاں ڈبل ڈبل حصے لا رہی ہیں، تیری وجہ سے کوئی میرے حصے کا ٹکڑا بھی نہیں دیتا۔''

(۲۰)

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ہجرت ایسے خاص موضوع پر کہانیاں لکھنے والی اِن خواتین کہانی کاروں کی کہانیوں کے مطالعے سے ایک بات تو واضح ہوتی ہے کہ مرد ادیبوں کی مانند خواتین کہانی کار بھی تقسیم کے اِس سارے عمل کو مشترکہ ہند اسلامی تہذیب و معاشرت کے بکھراؤ، مذہبی منافرت، متعصب فضا، عزت و ناموس کے انہدام، وحشت و بربریت اور قتل وخوں ریزی کا باعث قرار دیتی ہیں۔وہ بھی احساسِ تنہائی اور ناسٹلجیائی طرز احساس کو ہجرت ہی کی دین قرار دیتی ہیں کہ سرحدوں کی تقسیم و حد بندی نے جہاں جغرافیائی حدود کا تعین کر دیا تھا وہاں آہوں، سسکیوں اور کراہوں سے لبریز فضاؤں اور زندہ دلوں کو بھی ملول کر دیا تھا۔نیز اس تقسیم و ہجرت نے جان و مال کی قربانی کے ساتھ ساتھ عزت و آبرو کی پامالی اور اِنسانیت کو بھی سرنگوں کر دیا تھا۔یقیناً یہی وہ وجوہات تھیں جس کی بدولت سرحد کے دونوں اطراف موجود کم از کم ادیب و شعراء نے اس تقسیم و حد بندی کو قبولنے سے انکار کر دیا۔

حواشی

۱۔ شیخ محمد غیاث الدین، ہندو مسلم فسادات اور اُردو افسانہ (لاہور: المطبعہ العربیہ، ۱۹۹۹ء)،ص۲۳۔

۲۔ آئن ٹالبوٹ: ''تاریخ پنجاب''، مترجم پروفیسر طاہر کامران (لاہور: تخلیقات پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء)، ص۲۴۶۔

۳۔ محمد غیاث الدین، شیخ، ہندو مسلم فسادات اور اُردو افسانہ''،ص۲۷۔

۴۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی،''اُردو افسانہ قیام پاکستان کے بعد''، مشمولہ ماہنامہ نئی قدریں۳۹، شمارہ۳:۲، (۱۹۸۰ء):ص۱۵۔

۵۔ سعادت حسن منٹو،منٹوراما(لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۷ء)،ص۲۰۔
۶۔ انتظار حسین،شہرزاد کے نام(لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۲ء)،ص۹۔
۷۔ شہزاد منظر:''اُردو افسانہ آزادی کے بعد''،جلد۵شمارہ۱۷،ص۳۱۔
۸۔ نذیر احمد:''انتظار حسین کے افسانے:ایک مطالعہ''،مشمولہ''انتظار حسین: ایک دبستان''، مرتبہ ڈاکٹر ارتضیٰ کریم(دہلی:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۱۹۹۶ء)،ص۵۸۶۔
۹۔ اختر جمال،زرد پتوں کا بن(لاہور:التحریر پبلی کیشنز،۱۹۸۱ء)،ص۱۶۳۔
۱۰۔ اختر جمال،سمجھوتہ ایکسپریس(لاہور:مقبول اکیڈمی،۱۹۸۹ء)،ص۱۴۲۔
۱۱۔ الطاف فاطمہ،وہ جسے چاہا گیا(کراچی:شہرزاد پبلی کیشنز،۲۰۰۴ء)،ص۳۷:۳۸۔
۱۲۔ خدیجہ مستور،چند روز اور(لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۸ء)،ص۵۸۔
۱۳۔ ایضاً،ص۱۲۸۔
۱۴۔ قرۃ العین حیدر،شیشے کا گھر(لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۸ء)،ص۹۳۔
۱۵۔ ایضاً،ص۱۷۷۔
۱۶۔ شیخ محمد غیاث الدین،ہندو مسلم فسادات اور اُردو افسانہ،ص۱۷۰۔
۱۷۔ قرۃ العین حیدر،روشنی کی رفتار(لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۵ء)،ص۱۱۸:۱۱۹۔
۱۸۔ ہاجرہ مسرور،اندھیرے اُجالے(لاہور:مکتبہ اُردو،۱۹۵۳ء)،ص۱۷۲:۱۷۳۔
۱۹۔ ہاجرہ مسرور،تیسری منزل(کراچی:گلڈ پبلشنگ ہاؤس،۱۹۶۱ء)،ص۱۹۲:۱۹۳۔
۲۰۔ ایضاً،ص۲۳۔

مآخذ

- آئن ٹالبوٹ۔''تاریخ پنجاب''۔مترجم پروفیسر طاہر کامران۔لاہور:تخلیقات پبلی کیشنز،۲۰۰۶ء۔
- اختر جمال۔زرد پتوں کا بن۔لاہور:التحریر پبلی کیشنز،۱۹۸۱ء۔
- اختر جمال۔سمجھوتہ ایکسپریس۔لاہور:مقبول اکیڈمی،۱۹۸۹ء۔
- الطاف فاطمہ۔وہ جسے چاہا گیا۔کراچی: شہرزاد پبلی کیشنز،۲۰۰۴ء۔
- انتظار حسین۔شہرزاد کے نام۔لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۲ء۔
- خدیجہ مستور۔چند روز اور۔لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۸ء۔
- سعادت حسن منٹو۔منٹوراما۔لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۷ء۔
- عبادت بریلوی،ڈاکٹر۔''اُردو افسانہ قیام پاکستان کے بعد''،مشمولہ ماہنامہ نئی قدریں۳۹،شمارہ۳:۲،

(۱۹۸۰ء)

- غیاث الدین، شیخ محمد۔ ہندو مسلم فسادات اور اُردو افسانہ۔ لاہور: المطبعہ العربیہ، ۱۹۹۹ء۔
- قرۃ العین حیدر۔ روشنی کی رفتار۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء۔
- قرۃ العین حیدر۔ شیشے کا گھر۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء۔
- نذیر احمد۔ ''انتظار حسین کے افسانے: ایک مطالعہ''، مشمولہ انتظار حسین: ایک دبستان، مرتبہ ڈاکٹر ارتضیٰ کریم۔ دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۶ء۔
- ہاجرہ مسرور۔ اندھیرے اُجالے۔ لاہور: مکتبہ اُردو، ۱۹۵۳ء۔
- ہاجرہ مسرور۔ تیسری منزل۔ کراچی: گلڈ پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۶۱ء۔